امیر خسرو۔ ایک مؤرّخ کی حیثیت سے

عذرا وقار

امیر خسرو (۱۲۵۳ء ۔ ۱۳۲۵ء) کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان کے زرخیز خطے ماور النہر کے ایک قبیلے ہزارہ لاچین کے سردار تھے۔ جب وہاں چنگیز خان اور اس کے ماتحت سرداروں نے تباہی پھیلائی تو لاتعداد لوگوں کی طرح ان کے والد نے بھی برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا۔ یہاں اس وقت شمس الدین سلطان التمش (۱۲۱۱ ۔ ۱۲۳۶ء) کی حکومت تھی۔ اس نے امیر سیف الدین محمود کی بہادری اور جنگی مہارت کے باعث اسے اپنے امیروں میں شامل کر لیا۔ التمش ہی کے ایک اور نو مسلم امیر عمادالملک جو بلبن کے عہد میں وزارت کے عہدے تک پہنچے' کی بیٹی سے امیر سیف الدین کی شادی ہوئی جو امیر خسرو کی والدہ تھیں۔ آٹھ برس کی عمر میں ان کے نانا اور بیس برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ امیر خسرو بلبن کے بھتیجے کشلو خان عرف ملک چھجو کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور بالترتیب بلبن کے بیٹے بغرا خان' دوسرے بیٹے سلطان محمد والئی ملتان' حاتم خان والئی اودھ' بغرا خان کے بیٹے کیقباد' سلطان جلال الدین خلجی' علاؤ الدین خلجی' قطب الدین مبارک شاہ اور غیاث الدین تغلق کے دربار سے وابستہ رہے' جہاں پر انہیں شعر و شاعری اور تاریخ نویسی کے علاوہ میدان جنگ میں بہادری کے جوہر بھی دکھانے پڑتے۔

امیر خسرو نے بلبن سے لے کر سلطان محمد تغلق تک سات آٹھ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا جن میں سے بیشتر کے دربار سے وابستہ رہے۔ انہوں نے سلاطین اور امیروں ہی کی فرمائش پر اپنے عہد کی تاریخ لکھی۔ ان کے متعلق ان کے ہم عصر صاحبان علم نے جو رائے دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فن شاعری' جدت طرازی اور معنی آفرینی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔[1] وہ نوادر روزگار عالم تھے۔[2] اہل علم و فن ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ وہ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے اور وحدت الوجودی خیالات رکھتے تھے۔ وہ اختراع معنی' تصنیفات کی کثرت اور عجیب عجیب اسرار بیان کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے اور شاعری کی جملہ اقسام میں استاد تھے۔[3] امیر خسرو نظم و نثر میں

یکساں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بانوے (۹۲) کتابیں تحریر کیں لیکن چند کے علاوہ باقی سب ناپید ہیں۔ ان کے موضوعات میں شاعری، تاریخ، فن تصنیف و تالیف، روزنامچے، درباری محفلیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی تاریخی کتب میں قرآن السعدین (منظوم ۱۲۸۹ء) المفتاح الفتوح (منظوم ۱۹۹۱ء) الغزائن الفتوح (نثر، ۱۳۱۱) اعجاز خسروی (۱۲۸۳-۱۳۱۹)، دیول رانی خضر خان (منظوم ۱۳۱۶ء-۱۳۲۰ء) نوسپہر (۱۳۱۸) تغلق نامہ (۱۳۲۰) شامل ہیں۔[۴]

امیر خسرو کی تصانیف قرون وسطیٰ کے ہندی اسلامی تمدن کا مفصل ترین خاکہ پیش کرتی ہیں۔[۵] وہ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے تعلیم یافتہ، دولت مند مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی ادبی اور جمالیاتی تصورات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ دراصل امیر خسرو کی تاریخی تصانیف اپنے عہد کی تصویر بھی ہے اور اس کا نوحہ بھی۔ ان کا انداز اس دور کی تاریخ نویسی کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ چنانچہ اس میں شاعرانہ رنگ بھی ہے اور فصاحت و بلاغت کا جزو بھی۔ اس لفظی بناؤ سنگھار کے باوجود انہوں نے اپنے دور کی تاریخی واقعات کو ایک صاحب نظر انسان اور صاحب الرائے مورخ کی حیثیت سے پرکھا ہے اور ان کا تجزیہ اتنا معتبر ہے کہ کسی اور تاریخی ماخذ سے اس کا موازنہ کر کے حالات و واقعات کی ہو بہو تصدیق کی جا سکتی ہے۔

امیر خسرو نے ماضی کے واقعات کو موضوع نہیں بنایا بلکہ ہم عہد تاریخ کی سرگذشت بیان کی ہے۔ پھر انہوں نے یہ تاریخ کسی اندرونی تحریک کے تحت نہیں لکھی بلکہ سلاطین وقت کی فرمائش پر لکھی ہے۔ اسی لئے انہوں نے ہر اچھی اور مناسب بات کا ذکر کیا ہے اور ہر بری اور ناپسندیدہ بات یا واقعہ کو اپنی تحریروں میں جگہ دینے سے اعتراض کیا ہے۔ بہر طور ہم جب اس عہد کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو امیر خسرو ایک اہم ماخذ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ امیر خسرو کا اصل مقام ان کا اعلیٰ پائے کا شاعر، نثر نگار اور موسیقار ہونا ہے۔ وہ قصیدہ گوئی، وصف نگاری، ساقی نامہ اور غزل کی اصناف میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور یہی خوبیاں ان کی منظوم تاریخی تصانیف میں بھی موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے اس میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لے کر کہیں بھی تاریخی حقائق کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ جنوبی ایشیا میں ترک دور حکومت میں حسب نسب کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔ خصوصاً بلبن سرکاری عہدوں کی تفویض کے وقت "لا" ترک امراء کو ترجیح دیتا اور اس سلسلے میں

خاص طور پر جانچ پڑتال کرواتا کہ کوئی امیر کسی حوالے سے کم اصل تو نہیں۔[۶] امیر خسرو نے بھی شہزادوں کے قصیدے لکھے جس میں ان کے ذاتی کارناموں کو سراہا۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ انہوں نے صرف ترک شہزادوں اور امراء کے قصیدے لکھے۔ اگرچہ بعد میں جب ترک امراء کا خاتمہ ہو گیا تو انہوں نے ایسے ملوک کے قصائد بھی لکھے جو شہزادے نہیں تھے۔[۷] اس نسلی تفاخر کے رجحانات کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اس دور میں مذہبی و نسلی برتری کے زیر اثر شہنشاہیت کا ایک نیا تصور ابھر رہا تھا۔ چنانچہ امیر خسرو کے نزدیک بھی شہنشاہیت کے معیار وہی تھے جو بلبن' جلال الدین خلجی' علاء الدین خلجی اور غیاث الدین تغلق کے تھے۔ اس عہد کا ہیرو ایک مضبوط ارادے کا مالک' توسیع پسند' فاتح' حاکمانہ مزاج اور نظم و ضبط قائم رکھنے کا ماہر' منصف مزاج اور با شرح مسلمان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے اس نیم مذہبی رجحانات کے تحت بادشاہوں کے انہی اوصاف کو ابھارا ہے۔[۸] اس کے علاوہ انہوں نے جذبہ حب الوطنی کو اپنی تحریروں میں نمایاں جگہ دی ہے اور ارد گرد کے ماحول کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے جنگی مہموں کے بارے میں لکھتے ہوئے جوشیلے جذبات کا اظہار کیا ہے اور جنگ میں کسی محبوب کے شہید ہو جانے پر اس کا نوحہ بھی لکھا ہے۔[۹] انہوں نے اسلامی نقطہ نظر کے حوالے سے تاریخ کو تقدیر و خدا کی مرضی کے حوالے سے پرکھا ہے اور اسے سماجی قوتوں کے عمل یا نشو و نما کا نتیجہ قرار نہیں دیا۔[۱۰]

امیر خسرو کی تاریخ نویسی میں دو نمایاں رجحانات نظر آتے ہیں۔ پہلا رجحان ترک دور حکومت میں قرآن السعدین میں نظر آتا ہے' جس میں بلبن کے بیٹے بغرا خان اور اس کے بیٹے کیقباد کی ملاقات کا ذکر ہے۔ اس میں قصیدے اور غزل کی صنف کو نہایت کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے اور قصے کو دلکش بنانے کے لئے اس میں وصف نگاری سے کام لے کر رقاصاؤں' سازوں' کشتیوں کی قسموں کو بیان کیا ہے۔ ہر باب کے آخر میں کہانی کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے غزل کی صنف کو استعمال کیا گیا ہے' جن کے ذریعے شاعر کے اپنے تاثرات بیان کئے گئے ہیں۔ اس وقت شاہی شان و شوکت ہی طاقت کا مرکزو منبع تھی اور خسرو نہ صرف خود اس شاہی شان و شوکت سے مستفیض ہوئے بلکہ انہوں نے اس تصور کی پرورش و اصلاح کر کے اسے معاشرے کا بلند ترین آدرش بنا کر قرآن السعدین میں پیش کیا۔[۱۱]

امیر خسرو کی تاریخ نویسی کا دوسرا دور خلجیوں کے عہد سے شروع ہوا۔ اس دور کی خصوصیت یہ

تھی کہ جہاں پہلے ترکوں کو نسلی برتری کی وجہ سے اہمیت دی جاتی تھی وہاں اب یہ تفریق ختم ہونے لگی کیونکہ خلجی مقامی حکمران تھے۔ چنانچہ عام لوگوں کو بھی آگے بڑھنے کے مواقع میسر آنے لگے۔ اسی روح عصر کو خسرو نے اپنی تاریخ نویسی میں سمویا ہے۔ اب انہوں نے مقامی زبانیں بھی سیکھیں اور ایک نئے ثقافتی اظہار بیان کو زبان دی۔ انہوں نے ہندی میں گیت بھی لکھے اور ایرانی سازوں کو مقامی سازوں اور راگوں کے ساتھ ملا کر نئے راگ اور ساز ایجاد کئے۔ یوں وہ ایک نئے ثقافتی عہد کے نمائندہ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی تاریخ نویسی میں انہوں نے دارالخلافہ دہلی کے شب و روز، عمارتوں، موسموں، پرندوں غرض اپنے دور کی ثقافتی تاریخ بیان کر ڈالی ہے۔ اسی طرح جب علاؤالدین خلجی نے جنوبی ایشیا کے مختلف حصوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو امیر خسرو نے اپنے تخلیقی ذہن سے تمام علاقوں کی ثقافت کو اس انداز سے ابھارا کہ ایک نئی ابھرتی ہوئی یک جہتی کی سوچ ان کی تحریروں میں نظر آنے لگی ہے۔

علاؤالدین خلجی کا بیس سالہ دور حکومت (۱۲۹۶ - ۱۳۱۶) امیر خسرو کے لئے بڑا بار آور ثابت ہوا اور ان کا تخلیقی کام اپنے عروج پر رہا۔ پہلے انہوں نے نثر نگاری کی اور دو کتابیں ایک مفتاح الفتوح جو کہ جلال الدین خلجی کی فتوحات پر مبنی تھی، لکھی اور دوسری اعجاز خسروی جو فن تصنیف و تالیف پر مبنی تھی پانچ جلدوں میں لکھی۔ ایک اور کتاب خزائن الفتوح علاؤ الدین کے دور کی تاریخ اور اس دور کا واحد تاریخی ماخذ ہے۔ اس دور کے آخر میں مثنوی دیول رانی خضر خان جس میں علاؤالدین کے بیٹے خضر خان اور والئی گجرات کی بیٹی کے عشق کا قصہ بیان کیا ہے اور اس میں تاریخی واقعات نہایت خوبصورتی سے بیان کئے ہیں۔ جس سے تاریخی واقعات میں رومانوی ادب کا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔[۱۳] جہاں اس میں یہاں کے پھولوں، دھوپوں اور چاندنی کے بیان نے ایک حسن پیدا کر دیا ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ علاؤالدین خلجی کی جنگی مہموں کا بیان ہے۔ مثنوی نوسپہر مبارک شاہ خلجی کے دور کے بارے میں ہے[۱۴] اور نو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس میں ہندوستان کی عمارتوں، موسموں، جانوروں، پرندوں، مذاہب، زبانوں، علوم، مصوری، شاہی شکار کی مہم، شاہی جشن اور رقاصاؤں وغیرہ کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تغلق نامہ لکھی جس میں غیاث الدین تغلق کے دور کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

ان کی تصانیف سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ امیر خسرو کی سوچ میں بتدریج تبدیلی آئی۔ ان کی نظر میں نسلی، مذہبی اور سماجی برتری کو اہمیت حاصل نہ رہی۔ ان کی آزاد سوچ کی وجہ ان کی ہمہ جہت شخصیت، نکتہ رسی، حسن ظرافت، ذہانت اور ہردلعزیزی تھی۔ وہ صوفی منش انسان ہونے کے باوجود خشک ملا نہ تھے اور خود پسند، سارق، متعصب اور منافق علماء، جھوٹے صوفیاء اور کنجوس شہزادوں پر ہنستے تھے۔[15] جس طرح انہیں اپنے ترک ہونے پر فخر تھا اسی طرح ہندوستانی ہونے پر بھی ناز تھا۔ حکمرانی کے نقطہ نظر سے مقامی لوگوں کو نظرانداز کرنے کا جو رویہ اس وقت سلاطین نے اپنایا تھا وہ شروع میں اس کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر وہ کسی کو کسی سے کم تر نہ سمجھتے تھے اور ہندوؤں کی تصانیف، زبان اور ذاتی خصائل کی تعریف کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے خود کو رفتہ رفتہ مقامی رنگ میں ڈھال لیا۔ دربار سے ملنے والے انعام و اکرام کو بھی وہ لوگوں پر خرچ کر ڈالتے تھے۔

ایک مورخ کی حیثیت سے امیر خسرو کی تصانیف کو جانچتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے ہم عہد مورخین سے مختلف انداز رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخ نویسی میں اہمیت واقعات کے سلسلہ وار بیان کو نہیں بلکہ یہ افراد کے بارے میں یا نوع بنو مضامین کو اشعار میں باندھ کر مختلف اوقات میں دربار میں پیش کئے ہوئے ٹکڑے ہیں۔[16] اپنی منظوم تاریخ نویسی میں وہ سیدھے انداز میں بات کرنے کے بجائے اکثر الفاظ کی جادوگری دکھاتے ہیں۔ اس بات پر بہت اعتراض کیا جاتا ہے کہ ادھر ایک بادشاہ گذرا اور دوسرا تخت پر بیٹھا اور ادھر انہوں نے اس کا قصیدہ اور مدح سرائی شروع کر دی۔[17] اس سلسلے میں اس دور کے حالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ دہلی کے اکثر سلاطین بڑے ظالم و سفاک تھے اور بلبن کے بعد تو ہر سلطان نے اپنے پیش رو کو قتل کر کے تخت حاصل کیا۔ ایسے بہیمانہ اور سازشی ماحول میں خسرو کو زندہ رہنے کے لئے سب کچھ روا رکھنا پڑا۔ اس زمانے میں سیاست کسی اصول کے تحت تو تھی نہیں۔ بلکہ مطلق العنان بادشاہوں کی ملک گیری اور ان کے حریفوں کی باہمی کش مکش سے عبارت تھی۔ یہ سیاست بذات خود کردار کش تھی جس نے ان سے بدکردار سلاطین کی مدح لکھوائی اور جس کو وہ اپنی سیاہ روئی اور کذب گوئی سے تعبیر کر کے خود اپنی تکفیر کرتے ہیں۔[18] چنانچہ یہ دیکھ کر ہم جان سکتے ہیں کہ اس دور میں سچ بولنا کتنا مشکل تھا اور جو سچ بولتا وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ایسا کرتا تھا۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ وہ نہ صرف جنگوں میں شریک ہوتے بلکہ انہیں دربار میں حاضری بھی

دینا پڑتی۔ اس کے باوجود انہوں نے بہت لکھا اور اپنی تحریروں میں اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان کی شہرت ان قصیدوں کی وجہ سے نہ ہوئی جو انہوں نے شہزادوں کی شان میں لکھے بلکہ اس کا باعث حب الوطنی اور انسان دوستی کے وہ گیت ہیں جنہوں نے فارسی شاعری میں ایک نیا رجحان پیدا کیا اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں اتحاد کی ایک نئی روح پھونک دی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، (مترجم عبدالحئی خواجہ) جلد اول، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۴ء اشاعت دوم، ۳۹۴

۲۔ امیر خورد، سیر الاولیاء، (مترجم اعجاز الحق قدوسی)، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۸۰ء، ۸۹۰

۳۔ برنی ضیاالدین، تاریخ فیروز شاہی، (مترجم سید معین الحق)، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۹ء، ۵۲۱

۴۔ ہارڈی، پی، ہسٹوریئنز آف میڈیوئل انڈیا، لندن، موزیک اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۶۶ء، ۶۸ ۔ ۶۹

۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۸، ۹۳۳

۶۔ برنی۔ ایضاً، ۹۲

۷۔ ممتاز حسین، امیر خسرو دہلوی، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء، ۲۰۵

۸۔ امیر خسرو، قرآن السعدین تعارف از احمد حسن دانی، اسلام آباد، ایران پاکستان انسٹیٹیوٹ آف پرشین سٹڈیز، ۱۹۷۶ء، ۸

۹۔ ایضاً، ۹

۱۰۔ ہارڈی، پی، ایضاً، ۵۲۴

۱۱۔ امیر خسرو، قرآن السعدین، تعارف، ۹

۱۲۔ ایلیٹ۔ ایضاً، ۵۴۴، ۵۵۷

۱۳۔ امیر خسرو، نہ سپہر، انگریزی ترجمہ ایم ناتھ، فیاض گوالیاری، جے پور، ہسٹاریکل ریسرچ

ڈکیو منٹیشن پروگرام، ۱۹۸۱

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا، دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو، لاہور، پنجاب یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۲ء، ۲۳۲ ۔ ۲۳۳

۱۶۔ سید حسن عسکری، امیر خسرو ایز اے ہسٹورین، پٹنہ، خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، شان، ۱۱ ۔ ۱۳

۱۷۔ پروفیسر محمد حبیب، حضرت امیر خسرو آف دہلی، لاہور، اسلام بک سروس، ۱۹۷۹ء، ۲۱ ۔ ۲۲

۱۸۔ ممتاز حسین، ایضاً، ۲۴۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادبیات

سہ ماہی — اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کا موقر سہ ماہی مجلہ ادبیات جو خوبصورت کتابت و طباعت کے ساتھ نہایت کم قیمت میں پاکستانی ادب پر بیحد معیاری تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی نگارشات پیش کرتا ہے۔

بدلِ اشتراک

اندرونِ ملک:

فی شمارہ: ۲۰ روپے

سالانہ: ۷۵ روپے (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)

بیرونِ ملک:

امریکہ، کینیڈا، یورپ، مشرق بعید

فی شمارہ: ۷ ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ: ۲۵ ڈالر (〃 〃)

مشرق وسطی، بھارت، شمالی افریقہ

فی شمارہ: ۶ ڈالر (بذریعہ ہوائی ڈاک)

سالانہ چندہ: ۲۲ ڈالر (〃 〃)

اکادمی ادبیات پاکستان، سیکٹر ایچ۔ ایٹ/ون اسلام آباد۔ فون: ۲۵۴۵۶۸